حق و باطل

نعیم صدیقیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حق وباطل

قرآن میں حق اور باطل کی آویزش کے سلسلے میں مختلف مواقع پر حسب ذیل آیات وارد ہوئی ہیں:

(۱) وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَابَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَo لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ق صلے اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَo بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط

اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے اسے کھیل تماشے کی حیثیت سے پیدا نہیں کیا اگر ہم ایسا چاہتے کہ اسے سامانِ تفریح بنائیں تو ہم یقیناً بطور خود (بغیر کسی حکیمانہ نظم کے) اسے ایسا ہی بنا لیتے بشرطیکہ ہم یہی کرنے والے ہوتے (لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا ہے) بلکہ (کائنات کو بڑے محکم اصول حکمت کے ساتھ بنایا ہے جس کے مطابق) ہم حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں، پھر وہ (حق) اس (باطل) کا سر کچل دیتا ہے یہاں تک کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔

(۲) وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًاo

اور کہہ دو کہ (لو) حق آپہنچا اور باطل میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ بلاشبہ باطل تو ہے ہی بھاگنے والا۔

(۳) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِo لا تُؤْتِىٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ط ...وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ن اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ o

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے مثال دی ہے کہ پاکیزہ اصول ایک ایسے پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ خوب اچھی طرح (زمین میں) اتری ہوئی ہو اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں اور جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہمہ وقت پھل رہا ہو...اور (دوسری طرف) ناپاک اصول کی مثال اس ناپاک درخت کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے (بس ایک ہلکے جھٹکے میں) اکھاڑ لیا جائے۔ اس کے لیے کچھ بھی پائداری نہیں ہے۔

(۴) **اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّیۡلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَمِمَّا یُوۡقِدُوۡنَ عَلَیۡهِ فِی النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡیَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَّاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡكُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ** (رعد:۱۷)

اللہ نے بادل سے پانی برسایا تو ندی نالے اپنے اپنے مقدور بھر (پانی لے کر) بہہ نکلے پھر وہ سیل اپنے اوپر پھولا ہوا جھاگ اٹھالیتا ہے اور اسی طرح زیور اور دوسرے سامان ضرورت بنانے کے لیے آگ میں جو (دھات) پگھلاتے ہیں اس پر بھی جھاگ آجاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اللہ حق و باطل کی (مثال) بیان کرتا ہے تو پھر جہاں تک جھاگ کا تعلق ہے وہ تو سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے اور جو پانی کہ نوعِ انسانی کے لیے نفع بخش ہے وہ زمین میں باقی رہتا ہے۔

ان آیات کا منشا بالکل واضح ہے۔ ان میں ایک حقیقت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ دنیا کا نظام ایسے اصولوں پر بنایا گیا ہے کہ اس میں حق اور باطل دونوں قوتیں بالکل الگ الگ اور ممیز ہو کر باہم ٹکراتی ہیں۔ دوسری حقیقت یہ واضح کی گئی ہے کہ فتح اور پائداری اور استقلال و استقرار تمام تر حق، راستی، نیکی اور خیر کے لیے ہے۔ بخلاف اس کے باطل، جھوٹ، بدی اور شر کے لیے شکست، ناپائداری، عدمِ استقلال اور عدمِ استقرار مقدر ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی مستقل قدر اگر ہے تو حق میں ہے، باطل کی ساری قدر نمائشی ہے۔

یہ آیات جس ماحول میں نازل ہوئی تھیں اس میں حق اور باطل کے درمیان عملاً ایک سخت درجے کی کشمکش ہو رہی تھی اور عین اس کے درمیان حامیانِ حق کو یہ اطمینان دلایا جا رہا تھا

کہ پورا نظامِ کائنات حق ہی کے لیے سازگار ہے، باطل کی عارضی نشو ونما اگر ہوتی بھی ہے تو فطرتِ عالم کے کلّی تقاضے بہر حال اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ پس تم حامیانِ باطل کے کروفر سے مرعوب ہوئے بغیر جدو جہد جاری رکھو۔ آخر کار یہ بازی تمہارے ہی ہاتھ رہے گی۔ چنانچہ ان آیات سے اسلامیانِ عرب نے وہ جذبۂ یقین صحیح طریق سے اخذ کیا جس کے کارفرما ہو جانے کے بعد وہ نہ اس واقعہ سے ہراساں ہوئے کہ مشرکین عرب ہی نہیں بلکہ گردوپیش کی تمام اقوام، باطل کی بنیادوں پر زندگی استوار کیے ہوئے ہیں اور مٹھی بھر لوگ حق کے علمبردار بن کر نکل رہے ہیں، اور نہ وہ اس سوال سے پریشان ہوئے کہ وہ نظامِ حق جو کئی صدیوں سے معرض تعطّل میں ہے۔ آخر وہ آج کیسے غالب آسکتا ہے۔ چنانچہ ان کی جدو جہد کے نتائج نے ان پر عملاً ثابت کردیا کہ قرآن نے حق و باطل کی کش مکش کا جو فلسفہ پیش کیا تھا وہ ایک اٹل فلسفہ تھا۔

وہ فلسفہ آج بھی اٹل ہے اور آج بھی ہم اس سے جذبۂ صادق اخذ کرنے کے ضرورت مند ہیں کیوں کہ ہم بھی حق و باطل کی کشمکش کے طوفان میں کھڑے ہیں۔

لیکن ان آیات کے صحیح مفہوم کو نہ پا سکنے کی وجہ سے بعض اصحاب کو سخت غلط فہمی ہوتی ہے۔ چنانچہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ اسلام اور اس کے اصولوں کو ازروئے استدلال پوری طرح حق ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتے تو پھر وہ اپنے فوق العقلی عدمِ اطمینان کو اس دلیل سے ظاہر کرتے ہیں کہ اگر نیکی درحقیقت کوئی مستقل قدر رکھتی ہے اور فطرتِ انسانی سے اسے خصوصی مناسبت ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ نیکی کم ہے اور بدی کا زور ہے سچائی پر کار بند ہونے والوں کی تعداد قلیل ہے اور جھوٹ کو اختیار کرنے والوں کی بھاری اکثریت ہے؟ اور پھر یہ کہ اگر اسلام نظامِ حق تھا تو آخر وہ چلا کےَ روز؟ کل تیس ہی سال! پھر آئندہ کے لیے اس سے کیا توقّعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

یہ سوال مسلمان کہلانے والے بعض خاص اقسام کے مخالفینِ نظامِ اسلامی کی طرف سے بار بار اٹھایا جاتا ہے۔ اور ملکوں کو تو چھوڑیئے، خود پاکستان میں جو قائم ہی اس عزم کے اعلان کے ساتھ ہوا تھا کہ یہاں اسلامی نظامِ حیات رائج کیا جائے گا، شروع میں جب نظامِ اسلامی کا مطالبہ ابھرا تو یہ سوال زور شور سے سامنے آیا، اور اگرچہ درمیان میں کچھ دنوں کے لیے یہ دب گیا تھا مگر جب کہ عملاً اسلامی دستور کی تدوین کا مسئلہ سامنے آکھڑا ہوا ہے، اس سوال کی گونج پھر سنائی

دے رہی ہے۔ جب ''اسلام کے گھر میں'' اس کی غربت کا یہ حال ہو تو دوسرے مقامات سے جو کچھ بھی سننے میں آئے اسے تھوڑا ہی سمجھئے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس سوال پر تفصیل کے ساتھ غور کیا جائے۔

آیاتِ مذکورہ کا مقصدِ نزول یہ تھا کہ مسلمان جس حق پر عقل و وجدان کے لحاظ سے ایمان لا چکے تھے اس کے لیے کش مکش کرتے وقت یہ یقین رکھیں کہ کامیابی ہے ہی حق کے لیے اور اس یقین کی وجہ سے ان کا عزم اور ولولہ تازہ رہے۔ لیکن پیش نظر سوال کو ان آیات کے اصل منشاء کے ٹھیک خلاف استعمال کیا جا رہا ہے کہ آج جو لوگ عقل و وجدان کے لحاظ سے اسلام پر ایمان لا کر اس کے قیام کی جدو جہد میں مصروف ہیں کم از کم ان کے عزم کو متزلزل کر دیا جائے اور غیر شعوری طور پر وہ اسلام کے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا ہو جائیں کہ اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری ایسی موجود ہے کہ یہ اوّل تو اپنے غلبہ کے لیے سخت ترین بلکہ نا قابلِ عمل جدو جہد چاہتا ہے اور پھر اسے غلبہ ملے بھی تو اس میں زوال و اختلال بہت نمودار ہو جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ سوال جس سطحی طریق سے اٹھایا جاتا ہے اسی سطحی انداز میں اسے سنا بھی جاتا ہے پھر نہایت سطحی نگاہ سے اس سوال کی روشنی میں انسانی تاریخ و تمدّن کو دیکھا جاتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس بالکل سطحی تفکر کے ساتھ اس سے ایک نتیجہ برآمد کر لیا جاتا ہے یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال کے جواب میں ان تمام ضروری امور کو نمایاں کر دیں جن پر اچھی طرح نظر نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سوال کو دو حصّوں میں تقسیم کر لیں۔

ایک یہ کہ کیا حق ناکام ہے اور باطل کامیاب؟

دوسرے یہ کہ نظامِ حق صرف تیس سال کیوں چلا؟

کیا حق ناکام ہے اور باطل کامیاب؟

ایک اصولی نکتہ

اس سوال کے جواب میں جو بات اوّل قدم پر جان لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ حق کی ناکامی اور باطل کی کامیابی اصلاً کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ کامیابی اور ناکامی کا تعلق خود انسان سے ہے۔ اگر بالفرض سارے انسان مل کر حق کو قبول کرنے سے گریز کردیں تو پھر بھی حق ناکام نہیں ہوتا۔ ناکام وہ انسان ہی ہوتے ہیں جنہوں نے حق کو قبول کرنے سے گریز کیا اور اس کے فوائد سے بہرہ اندوز نہ ہوسکے۔ سچائی ایک اصول ہے اور اگر وہ اصول حق ہے تو خواہ اسے ساری دنیا قبول کرلے یا کوئی ایک متنفس بھی اختیار نہ کرے وہ بہرحال ایک اصول حق ہی رہے گا۔ جیسے صفائی اور طہارت ایک ایسا طبّی اصول ہے جو بجائے خود حق ہے۔ اسے کوئی مانے تو بھی حق ہے اور کوئی ایک متنفس بھی اس پر عمل پیرا نہ ہو تو بھی یہ حق ہی رہے گا۔ کامیاب ہم ان انسانوں کو سمجھیں گے جو اس اصولِ حق کو اپنائیں۔ پھر روشنی کی مثال لی جاسکتی ہے کہ ایک شخص روشنی کو پسند نہیں کرتا اور وہ آنکھیں بند کرکے چلتا ہے تو اس نتیجے میں ٹھوکر وہی خود کھائے گا اور ناکام بھی وہی ہوگا۔ روشنی کی ناکامی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ روشنی کو نہ کسی خاص منزل پر پہنچنا ہے نہ پاؤں چلنا ہے، نہ ٹھوکریں کھانے کا کوئی خطرہ درپیش ہے اور نہ کامیابی و ناکامی کے درمیان وہ معلّق ہے۔ اسے کوئی پوری طرح گل بھی کردے تو بھی ناکام وہ خود ہوگا۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر آگے چلیے۔

حق کی گرانی اور باطل کی ارزانی

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ جسے اندھیرا پسند ہو اسے کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا لیکن جو کوئی روشنی چاہے اسے دیئے، تیل، بتّی، چراغ دان کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی صحت بگاڑنا چاہیں تو یہ کام ہر لحاظ سے آسان ہے، لیکن بگڑی صحت کو بنانا ہو یا اچھی صحت کو بحال رکھنا ہو تو تازہ ہوا، ورزش، غسل اور صفائی، غذا کی درستی، سونے جاگنے اور کام کی باقاعدگی اور جذبات کو اخلاق کی نگہداشت کے لیے خاص طور پر فکر کرنی ہوگی زیادہ آسانی سے یہ بات یوں سمجھی جاسکتی ہے کہ ایک پہاڑ کی اونچی چوٹی سے نیچے لڑھکنا ہو تو اس ''مقصدِ جلیل'' کے لیے سوائے اس کے اور کچھ نہ کرنا ہوگا کہ آپ ایک دفعہ لڑھکنے کے لیے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ بخلاف اس کے اگر آپ نیچے سے اس چوٹی تک پہنچنا چاہیں تو آپ کو کشش زمین کے خلاف زور لگانا پڑے گا، قدم تھکیں گے، دم پھولے گا، اعصاب پر بار پڑے گا، دورانِ خون تیز ہوگا، قلب زور سے دھڑکے گا پسینہ آئے گا، تب کہیں جا کر آپ چوٹی پر پہنچیں گے۔ یہی معاملہ نیکی اور بدی اور حق و باطل کے بارے میں پیش آتا ہے۔ آپ کو سیرتِ بد مطلوب ہو تو کسی بڑی محنت کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن سیرت نیک کی تعمیر میں بڑی مشقت کرنا ہوگی اور پھر اس کی حفاظت کا انتظام کرنا ہوگا۔ آپ بدنامی کی متاع خریدنا چاہیں تو کوئی بڑی قیمت صرف نہیں ہوتی۔ لیکن نیک نامی اور عزّت و آبرو کی جنس پر عمر بھر کی کمائی کھپانی پڑتی ہے۔ آپ اپنی کھیتی میں اگر جھاڑ جھنکاڑ اگانا چاہیں تو نہ ہل چلانا ضروری نہ سرا دن پھیرنا ضروری، نہ پانی اور کھاد دینا ضروری، نہ باڑ لگانا اور نلائی کرنا ضروری۔ بلکہ یہ قیمتی فصل خود بخود نشو و نما پاتی رہے گی اس کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ آپ کھیتی کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ لیکن اگر آپ کوئی باغ اور چمن لگانا چاہیں یا غلے اور دوسری قیمتی اجناس کی فصل اگانا چاہیں تو اس کے لیے زمین جوتیں گے، بوئیں گے، پانی اور کھاد دیں گے، نلائی کریں گے، باڑ لگائیں گے، تب کہیں جا کر مدّعا حاصل ہوگا۔ حق کے لیے مشقت ضروری ہے اور باطل بغیر مشقت کے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ خیر پر بہت بڑی قیمت صرف ہوتی ہے۔ اور شر کوڑیوں کے مول بلکہ مفت لٹایا جارہا ہے۔ اخلاقی صفائی اور طہارت کے لیے بڑا انتظام ضروری ہے لیکن اخلاقی غلاظت کے لیے صرف تغافل و تساہل کافی ہے۔

اب فرض کیجیے کہ ایک شخص اچھی فصل لینے کے لیے محنت کرنے سے کتراتا ہے، اور زمین کو بے خبر چھوڑ دیتا ہے تو ناکامی اس کی ہوئی یا اچھی فصل کی؟ ایک شخص حفظانِ صحت کی فکر نہیں کرتا اور بیمار پڑتا ہے تو ناکامی صحت کے اصول کی ہوئی یا بیمار پڑنے والے کی؟ ایک شخص حق اور راستی کی دولت اور نیکی اور خوش خلقی کی متاعِ بے بہا کو خریدنے کے لیے محنت کی قیمت صرف کرنے پر تیار نہیں ہوتا تو ناکامی حق اور نیکی کی نہ ہوگی، خود خریدار کی ہوگی۔

کثرت وقلت کا معیار

یہ بات کہ حق قیمتی ہے اور باطل ارزاں ہے یا نیکی کے لیے محنت کی ضرورت ہے اور بدی کے لیے تن آسانی سے زیادہ کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سے قطع نظر کرکے لوگ جب اس امر واقعہ کو دیکھتے ہیں کہ اہلِ حق کم ہیں اور بندگانِ باطل کی کثرت پائی جاتی ہے، اور نیکی پر کاربند ہونے والوں کا تناسب بدی میں مبتلا ہونے والوں سے زیادہ نہیں ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ یہ حق کیسا حق ہوا اور یہ نیکی کیسی نیکی ہوئی کہ جسے قبول کرنے والے ہمیشہ اقلیت میں رہتے ہیں اور اکثریت باطل کے خدمت گزاروں اور بدی کے مسلک کے علمبرداروں کی ہوتی ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کہ نظامِ فطرت تمام تر اسی طرز پر مبنی ہے کہ اس میں جو چیز قیمتی ہے وہی کم بھی ہوتی ہے اور اس سے حصّہ پانے والے خوش نصیب لوگ بھی ہمیشہ کم ہوتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف جو چیز جتنی گھٹیا ہے وہ اتنی زیادہ بھی ہوتی ہے اور اس سے دامن بھرنے والوں کی ہمیشہ اکثریت ہوا کرتی ہے لیکن کیا گھٹیا چیز کی کثرت اسے قیمتی بنا سکتی ہے اور قیمتی چیز کی قلّت وگرانی اسے گھٹیا بنا سکتی ہے؟ یقیناً نہیں!

خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اونٹ کٹارا، بھٹ کٹیا اور جھاڑ جس کثرت سے اُگتے ہیں اس کے مقابلے میں یاسمین وگلاب اور لالہ ونرگس ہمیشہ کم ہوتے ہیں، یہاں بھوسے کے انبار کے انبار پائے جاتے ہیں لیکن سنبل وریحان کا جمال کمیاب ہے، یہاں سنگریزوں کی بے پناہ اکثریت ہے لیکن ہیرے اور جواہر انتہائی اقلیت رکھتے ہیں۔ یہاں پیتل، تانبے اور ٹین کی بڑی بڑی مقداریں ہر روز کانوں سے برآمد ہو رہی ہیں لیکن سونا بہت تھوڑی مقدار میں نکلتا ہے۔

یہاں سمندر کی ہر موج سیکڑوں خزف ریزے اُچھالتی رہتی ہے، لیکن وہ صدف جس سے موتی برآمد ہوشاذ و نادر ہی ہاتھ آتا ہے۔ یہاں جب دودھ کو بلویا جاتا ہے تو چھاچھ کی بہت بڑی مقدار حاصل ہوتی ہے لیکن مکھّن جو اس سے نکلتا ہے، مقدار کے لحاظ سے چھاچھ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہاں جنگلوں میں ہزار ہا ہرن پھلا نگتے ہیں لیکن مشک ختن جن کے نافوں سے حاصل ہوتی ہے وہ قلیل التعداد ہیں۔ یہاں یاوہ گوئی کے نمونے دن رات سڑکوں اور بازاروں اور مجلسوں میں سامنے آتے ہیں لیکن ادب وشعر کے حسین وجمیل نمونوں کا تناسب بہت ہی کم رہتا ہے۔ یہاں بیماری جیسی نا مطلوب شے عام ہے لیکن معیاری صحت جیسی جنس مطلوب کم ہی لوگوں کو حاصل ہے۔ لیکن آخر اس سے نتیجہ یہ کیسے نکل آئے گا کہ یاسمین وگلاب، سنبل وریحان، سونے، موتی، جواہرات، مکھن آہوئے ختن، ادب وشعر اور صحت کے لیے ناکامی ہے، کیوں کہ وہ مقدار و تعداد کے لحاظ سے کم ہیں اور دوسری طرف اونٹ کٹارے، بھٹ کٹیے، بھوسے، تانبے، پیتل، ٹین، خزف، چھاچھ، آہوئے بے نافہ، یاوہ گوئی اور بیماریوں کے لیے کامیابی ہے۔ کیوں کہ وہ تعداد ومقدار کے لحاظ سے پیش پیش ہیں؟

یہ نہ بھولیے کہ قیمتی چیز کی کم مقدار گھٹیا چیز کی زیادہ مقدار خرید سکتی ہے۔ جب دونوں متقابلاً ایک ہی منڈی میں سامنے رکھی جائیں تو حق اور خیر کی اقلیت باطل اور شر کی اکثریت سے زیادہ قیمت پائے گی۔ یعنی مدّعا ہے اس آیت کا کہ:

لَایَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ

ردّی چیز اور پاکیزہ دونوں برابر نہیں ہوسکتیں چاہے تمہیں ردّی چیز کی کثرت کتنی ہی بھلی کیوں نہ معلوم ہوتی ہو۔

فطرت نے ہر گھٹیا چیز کو اس لیے عام کیا ہے کہ اس کی قیمت گرادے اور اسے ذلّت کے مقام پر رکھے۔ اور اس نے ہر اعلیٰ چیز کو اس لیے کم رکھا ہے کہ اس کی قدر بڑھے اور گراں بہا ہو اور وہ تمام اہلِ عزم کی نگاہوں میں عزّت حاصل کرے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ فطرت اس ترتیب کو الٹ دیتی اور اس کی مارکیٹ میں سونا ارزاں ہوتا اور ٹین اور لوہا گراں بہا ہوتا؟ وہ یاسمین وگلاب کو ہر طرف اُگاتی پھرتی اور جھاڑ جھنکاڑ اُگانے کے لیے محنت ومشقت کا مطالبہ کرتی۔

ادب و شعر کی صلاحیت اس کے ہاں سے ہر کس و نا کس کو ارزانی ہوتی اور یا وہ گوئی کا آرٹ پیدا کرنے کے لیے اعلیٰ درجہ کے مخصوص دماغ کم تعداد میں فراہم کیے جاتے؟ صحت و تندرستی کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ محنت و اہتمام کی ضرورت بیمار ہونے کے لیے پڑتی؟ تعمیر مفت میں ہوتی اور تخریب کے لیے انسان کو قوتیں صرف کرنی پڑتیں؟ آدمی روشنی بہم پہنچانے کے لیے کسی ساز و سامان کا منت کش نہ ہوتا بلکہ اسے چراغوں اور بجلی کے قمقموں کی جگہ الٹے ایسے آلات کی احتیاج ہوتی جو اندھیرا پھیلا سکیں؟ بلندی کی طرف لپکنے کے لیے کوئی جسمانی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی بلکہ پستی کی طرف لڑھکنے کے لیے زور لگانا پڑتا؟ نیک بننے کے لیے کسی طرح کی تکلیف کی حاجت نہ ہوتی بلکہ الٹا بُرا بننے کے لیے لٹریچر، تعلیم، تبلیغ، جماعت بندی اور نظام ہائے حکومت کے قیام سے مدد لینی پڑتی؟ حق پر جمنے کے لیے انسان کسی تکلیف اٹھانے کا ذمّہ دار نہ ہوتا اور نہ انبیاء و کتب کا سلسلہ جاری کرنا پڑتا؟ بلکہ یہ سب کچھ فروغ باطل کے لیے ہوتا؟ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ آدمی کو جنت تو ملتی مفت میں، البتہ جو شخص دوزخ میں جانے کا خواہش مند ہوتا اس کو خاص طور پر ریاضتیں کرنی پڑتیں! ذرا موجودہ نظامِ فطرت کی ترتیب کو اُلٹ کر غور فرمائیے کہ کس طرح کا نقشہ مترتب ہوتا ہے۔

اس نظامِ فطرت کے اندر عالمِ انسانی میں بھی اعلیٰ خدمات انجام دینے کی صلاحیتیں رکھنے والے کم ہوتے ہیں اور معمولی قسم کے افراد زیادہ ہوتے ہیں، اہلِ حکمت، موجدین، معلّمین، مصلحین، ہنرور، مقرر، ادیب، شاعر، لیڈر اور اس طرح کے افراد کی تعداد کبھی بھی عامیوں سے زائد تو کجا برابر بھی نہیں ہوا کرتی۔ ان مناصب پر آنے کے لیے جہاں غیر معمولی فطری صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں وہاں اکتسابی لحاظ سے بھی محنتیں اور ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن عامی بننے کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ ٹھیک یہی صورت حق کے اصول پر جمنے، نیکی کو مشعلِ راہ بنانے اور اعلیٰ سیرت تعمیر کرنے والوں کو بھی ہے کہ انہیں کچھ تو فطری طور پر سلامتی طبع کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اکتسابی طور پر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہی بات تھی جسے علامہ اقبالؔ نے یوں پیش کیا کہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ؎ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پس حق پر جمنے والوں اور نیکی پر کاربند رہنے والوں کی کمی یہ معنی نہیں رکھتی کہ حق اور نیکی ناکام قوّت ہیں اور نہ باطل اور بدی کی راہ پر چلنے والوں کی کثرت اس کی دلیل ہے کہ باطل اور بدی کامیاب قوّت ہے! صحیح طرزِ استدلال یہ ہے کہ کامیاب وہ لوگ ہیں جو حق کی رفعتوں کی طرف بڑھنے کے لیے ضروری محنت کرسکیں۔ اور ناکام وہ لوگ ہیں جو حق کی منزلِ بلند کی طرف بڑھنے کی ہمّت نہ کرسکے اور باطل کے گڑھوں میں سہولت پسندی کی وجہ سے پڑے رہ گئے۔ زیادہ لوگ اگر گڑھے میں پڑے رہیں تو گڑھا پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں سے بلند نہیں قرار دیا جاسکتا اور اگر کم لوگ چوٹی پر پہنچے ہوں تو چوٹی گڑھے سے پست نہ ہوجائے گی۔

برائی، بھلائی کے روپ میں

فرض کیجیے کہ "لپٹن چائے" بہت ہی کامیاب اور مقبول ہوجائے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسری فرم جو لپٹن کے درجے کی چائے فراہم نہیں کرسکتی بلکہ وہ اپنی چائے کو گھٹیا پاتی ہے اگر میدان میں آنا چاہے تو کون سی چال چلے گی؟ وہ یہ کرے گی کہ اپنے ہاں کی چائے کا نام لپٹن سے ملتا جلتا رکھے گی۔ ٹریڈ مارک اس کے مشابہ بنائے گی، لیبل بھی اسی کے انداز کا بنائے گی اور کوشش کرے گی کہ بہت سے لوگ محض فریب نظر کی وجہ سے اس کا مال خرید لیں۔ آپ اب خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان طریقوں کو اختیار کرکے یہ نئی فرم خود اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ واقعی لپٹن کی چائے بہت ہی اعلیٰ درجے کی چائے ہے اور پھر وہ اپنا کاروبار جتنا پھیلائے گی درحقیقت اتنا ہی زیادہ خود لپٹن کی چائے کے لیے میدان ہموار کرے گی اسی طرح جو صراف پیتل کی انگوٹھی پر سونے کا ملمع کرکے بازار میں پیش کرتا ہے وہ سونے کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہے۔

بالکل ایسے ہی اگر آپ انسانی تاریخِ تمدّن اور تاریخِ اخلاق کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ برائی اور باطل جب بھی کبھی میدان میں لائے گئے ہیں حق اور نیکی کے روپ میں لائے گئے ہیں۔ گناہ کو ہمیشہ کامیاب ہونے کے لیے ثواب کا جامہ آراستہ کرنا پڑا ہے اور شر کو فروغ حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ خیر کی نقل اتارنی پڑی ہے۔ باطل اور بدی کے اس طریقِ

کار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہر باطل اور بدی اور نظامِ فاسد اور ان کے علمبرداروں نے اس بات کا خود اعتراف کر کے اپنی مساعی شروع کی ہیں کہ قدر و قیمت اگر ہے تو حق اور خیر کے لیے ہے اور کامیابی اگر حاصل ہو سکتی ہے تو راستی اور نیکی اور نظامِ صالح ہی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

آپ نے ہر جھوٹے کو دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرتا ہے لیکن کسی سچے کو بھی آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرے؟ آپ نے ہر دعوتِ حق دینے والے کو خیر کی علمبرداری کا اعلان کرتے ہوئے پایا ہوگا لیکن کبھی آپ نے ایسا بھی منظر دیکھا کہ کوئی دعوتِ خیر دینے والا شر کی علمبرداری کا اعلان کر رہا ہو؟ آپ نے ہر خادم باطل کو برسرِ حق ہونے کے دلائل دیتے ہوئے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ لیکن کبھی کسی صاحبِ حق کو یہ استدلال کرتے دیکھا کہ میں خادمِ باطل ہوں؟ آپ نے غیر اسلامی نظاموں کے قیام کی جدوجہد کرنے والوں کو بارہا دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو عین حاملِ اسلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن کیا کبھی آپ نے اسلامی نظام کے کسی داعی کو بھی غیر اسلامی نظام کے خادم کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتے دیکھا ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ پیتل پر لوگ سونے کا ملمع کر کے لاتے ہیں لیکن سونے پر کسی صراف نے پیتل کا ملمع کبھی نہیں کیا؟ کیا وجہ ہے کہ گھٹیا مال بیچنے والے لوگ اعلیٰ مال بنانے والوں کی نقل کرتے ہیں لیکن اعلیٰ مال بنانے والے نقلی مال بیچنے والوں کی نقل نہیں کرتے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ دراصل فطرت کے نظام میں اور انسانیت کے بازار میں اصل کامیابی حق اور نیکی ہی کے لیے مقدّر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ باطل اور برائی کے سوداگر جب بھی اپنا مال لاتے ہیں تو اس کو حق اور نیکی کے رنگ میں رنگ کر لاتے ہیں۔ وہ جھوٹ کو لاتے ہیں لیکن عزّت کے سائن بورڈ کے ساتھ۔ وہ شر کو لاتے ہیں لیکن خیر کے ٹریڈ مارک کے ساتھ وہ مفاد پرستی کو لاتے ہیں لیکن خدمت کا عنوان دے کر وہ مضرّت کو لاتے ہیں لیکن افادیت کا رنگ و روغن چڑھا کر!

نیکی اپنے نام کے ساتھ آتی ہے، بدی کے نام کے ساتھ نہیں آتی۔ لیکن دوسری طرف بدی کبھی اپنے نام کے ساتھ نہیں آتی نیکی کے نام کے ساتھ آتی ہے۔ خیر ٹھیک ٹھیک

اپنے روپ میں آتا ہے، شر کے روپ میں نہیں آتا۔ لیکن شر اپنے روپ میں نہیں آتا بلکہ خیر کے روپ میں آتا ہے۔ حق پوری طرح بے نقاب ہو کر نمودار ہوتا ہے۔ اپنے چہرے پر باطل کی نقاب نہیں ڈالتا۔ لیکن باطل میں بے نقاب ہو کر آنے کی جرأت نہیں۔ وہ مجبور ہے کہ حق کی نقاب اوڑھ کر آئے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق اور نیکی ہی کے لیے اصل کامیابی ہے وہ خود تو کجا ان کا نام بھی اتنا کامیاب ہے کہ بدی اور باطل بھی اسی نام کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں اس نام کا سہارا لیے بغیر وہ یکسر ناکام ہیں۔

باطل اور بدی کا حق اور نیکی کے نام یا روپ کو استعمال کرنا خود اس بات کی شہادت ہے کہ بازارِ حیات میں سارا فروغ حق اور نیکی کے لیے ہے۔

رہی یہ بات کہ حق کے روپ میں جو باطل لایا گیا اس سے کتنے گاہک دھوکا کھا گئے۔ نیکی کے لیبل سے جو بدی بھی پیش کی گئی تھی اس سے کتنے خریداروں کو نظر بندی ہوگئی۔ اس سے حق کی قدر و قیمت اور نیکی کی کامیابی اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر کسی بازارِ صرافہ میں ہزاروں گاہک بھی روزانہ ملمّع کی ہوئی انگوٹھیاں سونے کے بھاؤ خریدنے جائیں تو اس سے سونے کی کامیابی ناکامی سے اور پیتل کی کم قدری قیمت کی گرانی سے نہیں بدل جاتی۔ کامیابی اور ناکامی تو ساری خریداروں کی ہوگی کہ وہ کھرے اور کھوٹے کی تمیز میں چابک دستی دکھاتے ہیں یا کوتاہی۔

حق اٹل ہے، باطل متغیّر ہے

حق۔ اس کے جو جو بھی اصول ہیں، وہ از آدم تا ایں دم ایک ہی رہے ہیں لیکن باطل ان اصولوں کے جواب میں کوئی ایسے اصول نہیں لے کر آتا جو شروع سے اب تک ایک ہی رہے ہوں۔ باطل ہر دور میں نئے اصول لے کر اٹھتا ہے، نیا فلسفہ بناتا ہے، نیا استدلال گھڑتا ہے، نیا روپ دھارتا ہے، نئی قدریں لے کے آتا ہے اور پھر حق سے مقابلہ کرتا ہے یہاں تک کہ وہ شکست کھاتا ہے اور میدان چھوڑ دیتا ہے۔ پھر جا کر از سرِ نو کچھ اور اصول حاصل کرتا ہے کچھ اور

فلسفہ گھڑتا ہے کچھ اور استدلال تراشتا ہے اور پھر نئے لاؤلشکر کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ پھر شکست کھاتا ہے تو کسی نئے رنگ میں ابھرتا ہے اس کا کوئی اصول پائدار نہیں، کوئی رنگ پختہ نہیں کوئی فلسفہ اٹل نہیں کوئی استدلال ایسا نہیں جو پائے چوبیں نہ رکھتا ہو۔

بخلاف اس کے حق ہر دور میں ایک ہی اصول رکھتا ہے، ایک ہی فلسفہ سامنے لاتا ہے، ایک ہی استدلال پیش کرتا ہے۔ ایک ہی اس کا روپ ہوتا ہے اور باطل کے ہر حملے کے جواب میں وہ اپنے ایک ہی طرح کے ناقابلِ فسخ ہتھیاروں سے جنگ آزما ہوتا ہے حق کی فرم کے مقابلے میں ہزاروں فر میں قائم ہوتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں۔ پھر بنتی ہیں پھر ٹوٹتی ہیں لیکن وہ فرم بدستور اپنی جگہ جمی رہتی ہے۔

حق نے کہا خدا ایک ہے، لیکن باطل نے اس کے جواب میں کبھی دو خداؤں کا فلسفہ پیش کیا، کبھی تین خداؤں کا، کبھی بیشمار دیوتاؤں کا، کبھی ہمہ اوست کا، کبھی ''اندھی قوّت'' کی خدائی کا، کبھی الحادو دہریت کا، اور وہ برابر نت نئے فلسفے گھڑتا جاتا ہے۔ لیکن حق آج بھی یہی کہتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ حق نے کہا کہ سچائی، دیانت، پاسِ عہد، حفظِ عصمت احترام ملکیت ہمدردی واخوت، انسانی جان کا احترام، انسانی اخلاق کے بنیادی اصول ہیں، باطل نے اس کے جواب میں قسم قسم کے اخلاقی نظریے گھڑے، لیکن حق آج بھی اپنے قدیم اصولوں کی دعوت دیتا ہے اور وہی اصول آج بھی فطرتِ انسانی سے مطابقت رکھتے ہیں۔

باطل کی ناکامی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ آج تک وہ کوئی اٹل اصول انسانیت کے سامنے نہ رکھ سکا۔ وہ کوئی دعویٰ فطرت انسانی سے مستقل طور پر منوا نہ سکا۔ آج ایک چیز پیش کی اور کل خود ہی اس کی تردید کردی۔ آج ایک نظریہ بنایا اور کل خود ہی اسے توڑ کے پھینک دیا، باطل تو ایک ایسا مبتدی آرٹسٹ ہے جو اپنے بنائے ہوئے ہر نقش فن پر خود ہی تھوکتا ہے لیکن حق کے آرٹسٹ نے جو نمونۂ فن ایک مرتبہ پیش کردیا وہ پھر ہمیشہ کے لیے انسانی تاریخ کے عجائب گھر کی زینت بن گیا۔

کامیابی آخر وہ ہے یا یہ؟

رہا یہ سوال کہ حق کے مشکل اور نازک آرٹ کو آرٹسٹ کم ملے اور باطل کے سہل اور

غیر لطیف آرٹ کو آرٹسٹ بہت مل گئے تو اس سے نہ کسی فن لطیف کی قدر و قیمت گھٹتی ہے اور نہ کسی احمقانہ فن کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ دوامی قدریں رکھنے والے آرٹ کے تھوڑے آرٹسٹ مٹا مٹا کے بنانے اور بنا بنا کے مٹانے والے آرٹسٹوں کے بڑے سے بڑے لشکر پر بھی بھاری رہیں گے۔

حق قائم بالذات ہے، باطل طفیلی ہے

آپ نے کبھی یہ نہ دیکھا ہوگا کہ کسی کاشتکار نے پیازی یا گوکھروؤں کی فصل بوئی ہو، یا کوئی کھیت اسی طرح کی کسی فصل کو حاصل کرنے کے لیے جوتا اور سیراب کیا گیا ہو، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ آپ کارآمد فصلیں بوتے ہیں اور ان کی اوٹ میں زمین کی زرخیزی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ غیر مطلوب قسم کی بوٹیاں اور پھونس بھی اُگ آتی ہے۔ محنتی کسان ان کا استیصال کرنے کے لیے گوڑائی اور نلائی کرتا رہتا ہے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ طفیلی پودے مطلوبہ فصل کے حصّے کی غذا اڑا کر پل جاتے ہیں۔ پھر آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ تنہا آکاس بیل کہیں اُگی ہوئی پائی جائے اس کی نہ جڑ ہوتی ہے، نہ زمین براہِ راست اسے.....غذا دینے پر تیار ہوتی ہے۔ بلکہ ہمیشہ آپ دیکھیں گے کہ آکاس بیل کسی دوسرے درخت یا جھاڑی کے طفیل پرورش پاتی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ حق اور باطل کا ہے۔ باطل جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی حق کے سہارے پایا جاتا ہے۔ خالص باطل دنیا میں کہیں بھی وجود نہیں رکھتا، انسانی فطرت کی کھیتی میں وہ اگر اگتا ہے تو حق کی اوٹ میں اگتا ہے اور اس کے حصّے کی غذا کے بل پر پلتا ہے۔ یہ آکاس بیل کی طرح دوسرے درختوں اور پودوں کے اوپر پھیلتا، پھولتا اور پھلتا ہے۔

دنیا میں ہر برائی کسی نیکی کا سہارا لے کر جیتی ہے اور ہر گناہ کو کسی صواب کی اوٹ لینی پڑتی ہے۔ آج تک جتنے نظامہائے باطل پیش کیے گئے ہیں اور دنیا میں قائم ہوئے ہیں ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو خالص باطل اور خالص برائیوں پر مشتمل ہے بلکہ باطل اور برائی جب بھی چلی ہے تو اس حق اور نیکی کے بل پر چلی ہے جس کا کچھ کچھ جز ہر نظامِ باطل میں شامل رہتا ہے۔ تمام نظامہائے باطل خالص باطل ہونے کے بجائے حق و باطل کے مرکبّات ہوتے ہیں اور ان کی

مقبولیت، ان کا قیام اور ان کا استحکام اور ان کا پھیلاؤ حق کی اس مقدار کے اوپر منحصر ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ جی جاتے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری میں بھی باطل موجود ہے اور نظامِ اشتراکی میں بھی باطل کا ایک بڑا اجز شامل ہے لیکن حق کی ایک مقدار اس کے ساتھ بھی ہے اور ایک اس کے ساتھ بھی ہے۔ اور یہی حق کی مقدار ہے جس کے سہارے دونوں کے باطل جی رہے ہیں۔ اس کے پاس بھی بعض بھلائیاں ہیں جن میں انسانیت کے لیے اپیل موجود ہے اور اس کے پاس بھی کچھ خوبیاں ہیں جن میں فطرتِ آدم کے لیے کشش ہے۔ یہ دونوں جب بھی بلاتے ہیں تو اپنے بھلائی کے پہلو سامنے لاکر بلاتے ہیں اور لوگ انہیں قبول کرتے ہیں تو ان کی ان بھلائیوں ہی کے لیے قبول کرتے ہیں۔ ان کی برائیاں تو ان بھلائیوں کے اوپر آکاس بیل کی طرح لپٹی ہوئی ہیں کہ ان کو قبول کیجیے تو از خود ساتھ آئیں گی۔

جب کوئی نظامِ باطل حق کی کم سے کم مطلوبہ مقدار کو بھی کھو بیٹھتا ہے تو پھر اس کا پنپنا محال ہو جاتا ہے اور خالص باطل کے لیے تو دنیا میں کوئی چانس ہی نہیں۔

تاریخ کو اِس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی نظامِ باطل کے قیام و بقا کا انحصار بھی اس کے جزوِ حق پر ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس کی کامیابی دراصل حق کی کامیابی ہی کا نتیجہ ہے۔ ماضی ہو یا حال، ہر اصول اور فلسفہ اور نظام اپنے جزوحق کی وجہ سے مقبول اور قیام پذیر ہوتا ہے۔

حق و باطل کے مرکبات کا تصادم

تاریخ اصولوں، فلسفوں اور نظاموں کے تصادم کی جولانگاہ ہے۔ اس تصادم میں کامیابی اور ناکامی جس اصول پر ہوتی ہے وہ خود گواہی دیتا ہے کہ کامیاب حق ہے اور باطل بہر حال ناکام ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ خالص باطل کے لیے دنیائے انسانیت میں کوئی جگہ نہیں، حق و باطل کے مرکبات پائے جاتے ہیں۔ ان مرکبات میں تصادم ہوتا ہے اور ہر تصادم میں بازی اس اصولِ فلسفہ اور نظام کے ہاتھ رہتی ہے جس میں باطل کا تناسب کم اور حق کا تناسب زیادہ ہو۔

پانچ فیصدی حق اور دس فیصدی حق رکھنے والے اصول و نظام کے درمیان اگر ٹکر ہوگی تو دس فیصدی حق رکھنے والا نظام میدان مار لے گا۔ وہ ساری توڑ پھوڑ جو ذیل کی آیت کی رُو سے ہوتی ہے اسی اصول پر ہوتی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

اگر اللہ تعالیٰ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ نہ ہٹاتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔

پھر قانونِ تصادم کے تحت قرآن کا فلسفہ یہ بتاتا ہے کہ مرکّبات حق و باطل میں سے کوئی بھی جب خالص حق کے سامنے آتا ہے تو اس کے لیے آخر کار لازماً شکست مقدّر رہوتی ہے جن آیات کو اس مضمون کے آغاز میں درج کیا گیا ہے ان میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ جب بھی کوئی گروہ خالص حق کو لے کر اٹھتا ہے اور اس کے لیے کما حقہ جدو جہد کرتا ہے تو آخر کار کامیابی اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ اَلْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (انجام کار اہل تقویٰ کے لیے ہے)

خالص حق کے علمبرداروں کی کمی کیوں؟

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب حق انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے، جب نظامِ کائنات پوری طرح سازگار اسی کے لیے ہے، جب حقیقی اور پائدار کامیابی بھی اسی کے لیے مقدر ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کے علمبردار اقلیت میں رہتے ہیں؟ اس کا جواب اوپر دیا جاچکا ہے تاہم اس کی مزید وضاحت کر دینا چاہتے ہیں۔

صفائی انسانی فطرت کے مطابق بھی ہے اور صفائی میں پوری پوری افادیت بھی ہے لیکن پھر بھی صفائی کے تقاضے پورا کرنے والوں کی تعداد کم ہے، اور صفائی کی نمائش کی اوٹ میں ہر طرح کی غلاظتوں کو چھپا چھپا کر رکھنے والوں کی اکثریت ہے۔ صحت ہر شخص کو محبوب ہے اور بیماری کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا، لیکن وہ لوگ جو حفظانِ صحت کے اصولوں پر پوری طرح کاربند ہوں اور بیماری سے بچنے کی تدابیر اختیار کریں۔ بلحاظ تناسب اقلیت میں رہتے ہیں۔ جو صورتِ معاملہ یہاں ہے وہی حق کے اختیار کرنے میں بھی ہے۔

انسان میں ایک طرف بھلائی اور فائدے کی خواہش موجود ہے اور دوسری طرف اس میں سہولت پسندی اور آرام طلبی کا رجحان بھی کارفرما ہے۔ بھلائی اور فائدے پر محنت صرف ہوتی

ہے اور محنت صرف کرنے میں آرام طلبی کا رجحان مانع ہوتا ہے۔ ان دونوں رجحانات کی کش مکش کے تحت آدمی کو عجیب قسم کے احوال پیش آتے ہیں۔ وہ کبھی قریب کے چھوٹے فائدے کو دور کے بڑے فوائد پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ کسی فوری مشقت سے بچنے کے لیے بعد کی تکلیف کو گوارا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ تھوڑی محنت کر کے تھوڑا سا فائدہ حاصل کرنے کو اس سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے کہ زیادہ محنت کر کے زیادہ بڑا فائدہ حاصل کرے۔

اب چونکہ حق یا باطل کو قبول کرنے پر انسان کو فطری جبریت میں مبتلا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ آزادی سے خود انتخاب کرے، اس وجہ سے خالص حق کی گراں بہا دولت کو حاصل کرنے کے لیے محنت و ایثار کی بھاری قیمت ادا کرنے والے مردانِ جری کم ہوتے ہیں اور حق و باطل کے سستے مرکبات کے لیے محنت و ایثار کی تھوڑی پونجی صرف کرنے والے زیادہ نکلتے ہیں۔ جیسے سستے مال کے گاہک ہمیشہ زیادہ پائے جاتے ہیں۔

اگر انسانوں کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ حق و باطل میں سے خود کسی ایک کو انتخاب کریں۔ اور ساری زندگی اس کی خدمت میں صرف کردیں تو ظاہر بات ہے کہ اس آزادی کے تحت یہ واقعہ ہونا کچھ بھی بعید نہیں کہ ایک بڑی اکثریت خالص حق سے اعراض کرے پھر وہ کسی غلط اصول اور باطل نظام کی علمبردار بنے۔ وہ اس کے لیے دعوت پھیلائے، وہ اس کے لیے منظّم ہو، وہ اس کے لیے ذرائع و وسائل جمع کرے۔ وہ اس کے لیے لڑائیاں لڑے، وہ اس کے لیے لٹریچر اور نظامِ تعلیم فراہم کرے، وہ اس کے سامنے ساری دنیا کی گردن جھکانے میں مصروف ہو جائے۔ یہاں تک کہ اس کا غلبہ عالم گیر ہو اور وہ تاریخ کے ایک طویل دور پر چھا جائے۔

ایسا ہی ایک دور ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں اور اس میں باطل کا غلبہ دیکھ کر بظاہر اتنی مرعوبیت طاری ہوتی ہے کہ غلبۂ حق کے امکان سے مایوسی ہوتی ہے حالانکہ یہ دوسرا امکان بھی اسی طرح موجود ہے۔

باطل کے غلبہ کے لیے اس کے حامیوں کی بہت بڑی اکثریت جتنا کام کرتی ہے وہی کام حق کے حامیوں کی نسبت بہت کم تعداد سرانجام دے سکتی ہے اور اہل حق کا ایک مختصر گروہ اگر معیاری درجے کا ہو تو وہ ساری انسانیت کی زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے سکتا ہے۔ یہ معیاری حق پرستی وہ فرق ہے جو ادھر کی کثرت اور ادھر کی قلّت کا توازن (Balance) برابر کر دیتا ہے۔

نظامِ حق صرف تیس ۳۰ ہی سال کیوں چلا؟

دوسرا سوال جو اسلام کے نظامِ صالح کے قلیل مدّت تک چلنے کے بارے میں اٹھایا جاتا ہے اور جس کے اندر دراصل یہ استدلال چھپا ہوتا ہے کہ جب ایک نظام اپنے آپ کو زیادہ دیر تک زندہ رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تو اس کے لیے بیش بہا قربانیاں کیوں دی جائیں، اور اس کے بجائے کیوں نہ کسی دوسرے نظام کو اختیار کرلیا جائے، اپنے جواب میں متعدد ضروری تصریحات چاہتا ہے۔ ہم ان تصریحات کو نمبروار درج کرتے ہیں:

تصریحِ اوّل

اگر کسی نظام یا اصول کو قبول کرنے اور اسے عملاً برپا کرنے کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے شرطِ اوّل یہ ہوتی کہ اس کا ماضی میں دیر تک چلنا ثابت کردیا جائے تو شاید نہ دینِ جمہوریت کو کوئی کارکن ملتا اور نہ دینِ اشتراکیت کو۔ ان دونوں نظاموں میں سے کسی ایک کو بھی ماضی کی تاریخ میں قدم جمانے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ان کے علمبرداروں نے اپنے لیے صرف اتنی بات کافی سمجھی کہ ان کا عقلی اطمینان ہوجائے جب ان کے دلوں نے گواہی دی کہ یہ اصول و نظام برحق ہے اور افادیت اسی میں ہے تو پھر انہوں نے اس کے لیے بازی لگادی۔ وہ احمق ہوتے اگر عقلی اطمینان کے بعد اور دل کے ٹھک جانے کے بعد پھر یہ سوچنے بیٹھ جاتے کہ جب پہلے ہزاروں انسانی نسلیں گزر گئیں اور کسی کو اس اصول و نظام کو قائم کرنے کی ہمّت نہ ہوئی تو آج ہم یہ حرکت کس امید پر کرنے لگے ہیں۔

ان دونوں رائج الوقت نظاموں کے بخلاف اسلامی نظام کے علمبرداروں کے لیے تو عملی تحریک کا دوہرا سامان موجود ہے۔ وہ اپنے لیے عقلی اطمینان کے پورے وجوہ بھی اسلام میں پاتے ہیں اور پھر وہ تاریخ سے یہ شہادت بھی پاتے ہیں کہ یہ نظام پہلے بھی قائم رہا ہے اور اپنی معیاری شکل میں تیس سال تک ماضیِ قریب میں چل چکا ہے۔ جب کہ وسائل تمدّن موجودہ دور سے بہت کم تھے۔

تعجب ہے کہ جن نظاموں کا کوئی ماضی نہ تھا انہیں جب کارکن مل گئے تو وہ نہ صرف قائم ہوئے بلکہ ساری دنیا پر اُن کے اثرات پھیل گئے۔ لیکن جس نظام کا ایک مضبوط ماضی موجود ہے اس کے کارکن تذبذب میں مبتلا رہیں۔

تصریح دوم

یہ سمجھنا کہ اسلام دنیا میں صرف ایک بار برپا ہوا اور وہ بھی ۳۰ سال کے لیے، قرآن اور تاریخ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اگر چہ قرآن نے پوری تاریخِ رسالت نہیں بیان کی ہے مگر پھر بھی جو کچھ اس نے بیان فرمایا ہے اس سے اتنی بات تو بہر حال ثابت ہوتی ہے کہ سب سے پہلے آدم علیہ السّلام نے اپنی ذریت کے اندر اسلامی نظام کو قائم کیا۔ پھر یوسفؑ کے ذریعہ یہ مصر میں قائم ہوا۔ اور دیر تک اس کے اثرات قائم رہے اور پھر حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السّلام نے اسے برپا کیا اور ایک مدّت تک اسے بڑی وسعتوں کے ساتھ چلایا۔ اور پھر قیاس کر لیجیے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں نہ معلوم کتنے انبیاء و صلحاء مختلف خطّوں کے اندر ایسے گزرے ہوں گے جنہوں نے اسی نظام کو بار بار برپا کیا ہوگا (قرآن میں صرف ان اقوام کے انبیاء اور ان ملکوں کی دینی تاریخ کا تذکرہ ہے جس سے عرب براہِ راست متعارف تھے) پھر آخر میں نبیؐ کے ذریعہ یہی نظامِ حق اپنی معیاری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس پر نہ معلوم لوگ کیسے کہہ دیتے ہیں کہ اسلامی نظام دنیا میں صرف ۳۰ سال چل کے ختم ہوگیا؟ اسلامی نظام تو بار بار اپنے آپ کو دہراتا چلا آرہا ہے! بخلاف اس کے کوئی غیر اسلامی نظام ایسا نہیں جو مٹ مِٹ کر پھر قائم ہوا ہو۔

تصریحِ سوم

صرف ۳۰ سال کا وہ مفہوم بھی غلط ہے جو معترض حضرات لیتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ اسلامی نظام بھی بالکل شہید ہو گیا اور اس کی پوری عمارت پیوندِ زمین ہو گئی۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں، اصل صورت حالات جو کچھ تھی وہ یہ تھی کہ پورے اسلامی نظام میں ایک ''اصولِ انتخاب'' ساقط کر دیا گیا باقی سب کچھ جوں کا توں رہا، قانون وہی تھا، اقامتِ عبادات کا نظم وہی تھا، جہاد فی سبیل اللہ کی سرگرمیاں اسی طرح رہیں۔ معاشرتی نظم وہی رہا، عوامی اخلاق کی بنیاد اس اسلام ہی پر تھی، نظامِ تعلیم اسی طرح تھا۔ بلاشبہ معیاری نظام کو جب ہم سامنے رکھتے ہیں تو اصولاً ہم یہی رائے قائم کرتے ہیں کہ نظام بدل گیا۔ لیکن یہ تبدیلی کُلّی نہ تھی بلکہ پہلے بگاڑ نے اس قلعے میں گھسنے کا صرف ایک چور دروازہ بنالیا تھا۔ پھر باقی تبدیلی بہت ہی تدریجی طریق سے واقع ہوئی۔ ایک عمارت میں سے آہستہ آہستہ ایک ایک اینٹ بدلی جاتی رہی اور بہت دیر بعد تک جا کر اس عمارت کا بیشتر حصہ متغیّر تھا۔

اصل میں سارا بگاڑ شاہی محل اور دربارِ خلافت کے اندر پیدا ہوا لیکن عوامی زندگی بحیثیت مجموعی اسی صالح نقشے پر استوار رہی جسے دورِ سعادت میں جما دیا گیا تھا۔ یہ حالت حالات کے فرق کے ساتھ کم وبیش سات آٹھ سو سال تک جاری رہی۔ بالکل آخری دو چار صدیاں ایسی تھیں جب کہ عوام میں اخلاقی انحطاط پھیلا۔ معیشت و معاشرت میں مفاسد گھسے اور سوسائٹی اسلامی بنیادوں سے اکھڑنے لگی۔ اور ان ہی صدیوں میں امت کا سفینہ زوال کی موجوں کا شکار ہوا۔ جب تک نظامِ حق کی اصل قدریں زندگی میں غالب رہیں، مسلمان ترقی کرتے گئے۔ اگر چہ ان کے سلاطین امراء بگڑتے جا رہے تھے لیکن جب نظامِ حق کی قدریں کمزور پڑ گئیں تو پھر زوال غالب آ گیا۔

یہ اسی ۳۰ سال کے معیاری دور کا کرشمہ تھا کہ اس کی پیدا کردہ اخلاقی قوت ملت اسلامیہ کو کئی صدیوں تک ترقی کی راہ پر دوڑاتی چلی گئی اور تاریخ میں ان کو ایک لمبا دورِ اقبال عطا کیا گیا۔ اس ۳۰ سال کی پیدا کردہ قوت جب گھٹنے لگی اور اس کی کمی کو پورا کرنے کا کوئی اہتمام نہ کیا

گیا تو مسلمانوں کے تمدّن کی گاڑی پہلے سست رفتار ہوئی، پھر دھیمی ہوتے ہوتے بالکل رُک گئی۔

اس ہزار سال کے دور کو لوگ جب ''صرف ۳۰ سال'' کے الفاظ میں سمیٹ کر سامنے لاتے ہیں تو ناواقف آدمی کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

تصریحِ چہارم

اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس کے علمبرداروں نے نبی اکرمؐ کی قیادت میں جب اسے بحیثیت نظام کے قائم کر دیا، تو چاہے وہ بقول معترضین صرف ۳۰ سال چلا ہو بہر حال اپنی پوری معیاری شان کے ساتھ چلا۔ نبی اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ اور مسلمان عوام سب کے سب اس بات پر پوری طرح مطمئن تھے کہ جو کام ان کو کرنا تھا انہوں نے اسے کماحقہ، انجام دے دیا، اور ان کو نہ کوئی معذرت کرنی پڑی، نہ کوئی حسرت لے کر رخصت ہوئے انہیں جیسی زندگی مطلوب تھی اسے عملاً سو فیصدی معیار پر قائم کر کے دکھایا۔

لیکن آج جن نظاموں سے مرعوب ہو کر لوگ ''صرف ۳۰ سال'' کا سوال اٹھاتے ہیں انھوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ یہ جمہوریت اور یہ اشتراکیت تو اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق اب تک زمین کے اوپر ایک لمحے کے لیے بھی قائم نہیں ہوئی۔

جمہوریت کے تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ معیاری جمہوریت ابھی تک صرف کتابی اصولوں میں پائی جاتی ہے، سطحِ ارض پر کہیں بھی نافذ نہیں ہے۔ برناڈ شا کے الفاظ میں ابھی یہ بمشکل کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کے لیے تڑکے کا وقت آیا ہے (پاکٹ ہسٹری آف دی ورلڈ) ہنڈرک دان لون اپنی تاریخِ عالم کے آخر میں کیا خوب کہتا ہے کہ ''لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ ابھی ہم درجنوں غلط پگڈنڈیوں کو اختیار کریں گے تب کہیں جا کر شاید صحیح سمتِ سفر پا سکیں۔''

مارکسزم کے متعلق بھی یہ بالکل واضح ہے۔ اس کے ''مومن'' خود کہتے ہیں کہ ابھی ہم ایک عبوری دور (Transitional Period) سے گزر رہے ہیں۔ معیاری حالت جو ان کے پیشِ نظر ہے اس میں پہنچنے کے بعد ایک تو ریاست کا وجود ختم ہو جائے گا جسے آج ایک ناگزیر بُرائی (Necessary Evil) کی حیثیت میں اختیار کیا گیا ہے، اور دوسری تبدیلی یہ آئے گی کہ ہر شخص

اپنی قوت وصلاحیت کے مطابق کام کرے گا اور اپنی ضروریات کے مطابق بدلہ پائے گا۔ اس معیاری حالت اور آج کی حالت کے درمیان نہ معلوم کتنی صدیوں کا وقفہ حائل ہے۔ اصل سرخ جنت مستقبل کے بہت ہی بعید گوشوں میں مستور ہے۔

پس جن نظاموں سے آج ہمیں سابقہ ہے، ان میں سے کوئی بھی اپنی معیاری شکل میں ابھی ایک منٹ کے لیے بھی برپا نہیں ہوا۔ بلکہ ان کے علمبردار ابھی ادھ کچرے نظام لیے چل رہے ہیں۔ بخلاف ان کے اسلام اگر اپنے کارکنوں کو بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے بلاتا ہے تو انھیں ماضی میں اپنے پیش کردہ نظام کو تیس سال تک معیاری شکل میں چلتا ہوا دکھاتا ہے۔ کون سا دوسرا نظام ایسا ہے جو تیس سال نہ سہی، صرف ایک ہی سال کے لیے اپنے اصولوں کا سو فیصدی عملی نفاذ تاریخِ انسانی میں دکھادے۔

تصریحِ پنجم

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو ایک مرتبہ مٹ جائے تو اس کے احیاء کا جذبہ عوام میں برقرار رہے یا اس میں اصولی تبدیلیاں پیدا کر دی جائیں تو ان تبدیلیوں کے خلاف جدوجہد کر کے بنیادی اصولوں کو دوبارہ تازہ کرنے کی فکر کی جائے۔

جن ملکوں میں پاپائیت تھی وہ جب مٹ گئی تو کوئی نہ تھا جو اس کے احیاء کا خواہشمند ہو، جاگیردارانہ نظام جہاں جہاں مٹا وہاں پھر اس کی تجدید کرنے کے لیے کبھی کوئی تحریک نہ اٹھی سرمایہ داری مٹتی ہے تو کوئی اس کے تن مردہ میں دوبارہ جان ڈالنے کے لیے کوشش نہیں کرتا بلکہ غیر اسلامی نظاموں کے علمبردار اپنے ماضی کو کراہیت سے دیکھتے ہیں اور اپنی سابق کارگزاریوں کے لیے معذرتیں پیش کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے اسلامی نظام کے علمبرداروں کے لیے ان کا ماضی قابلِ فخر اور زندگی بخش رہا ہے اور وہ اسی ماضی کے احیاء کو مستقبل کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ پسند کرتے رہے ہیں۔ دورِ حق ۳۰ سال تک محدود سہی لیکن بہر حال وہ ایک ایسا مقدس دور ہے کہ اس میں کسی کو کوئی شرمناک چیز نہیں ملتی۔ اس دور کے کسی واقعہ پر معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور ہم اس دور کے واقعات کو تو سبق آموز غلطیاں قرار دیتے ہیں نہ ان غلطیوں سے بچ نکلنے کا نام ترقی رکھتے ہیں۔

جمہوری ممالک میں نظامِ زندگی متغیّر ہے لیکن لوگ اسے ترقی قرار دیتے ہیں۔ اور پچھلے طریقوں کو نادانی کے تجربات سمجھتے ہیں۔ "حاضر" کو بدلنے کی سعی تو ہوتی ہے لیکن سابق کے احیاء کے لیے جدّ و جہد کرنے کی رجعت پسندانہ حرکت کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خود کمیونزم کے نظام میں اس سے بہت بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ جیسی تبدیلی اسلامی نظام کے اندر حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں واقع ہوئی تھی۔ بلاتشبیہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لینن اور ٹراٹسکی کا اختلاف اس اختلاف سے کم زوردار نہ تھا جو اسلامی تاریخ میں حضرت امیر معاویہؓ کے طرزِ عمل سے امام حسینؓ کو ہوا تھا۔ جس طرح ہمارے یہاں تاریخ کی رو امام حسینؓ کو شہید کرتی ہوئی آگے نکل گئی، اسی طرح روس میں اشتراکی تاریخ کی موجوں نے ٹراٹسکی کو اٹھا کے ایک خزف ریزے کی طرح پرے پھینک دیا۔ وہاں بھی نظام میں اصولاً تغیّر آیا تھا اور یہاں بھی آیا۔ لیکن دونوں طرف ایک جیسے واقعات کے لیے احساسات مختلف ہیں۔ واقعۂ کربلا کے ظہور پر ہماری تاریخ نے جو موڑ موڑا تھا ہم اس کو غلط کہتے ہیں لیکن روسی تاریخ نے جو موڑ موڑا تھا اس تاریخ کے بنانے والے اس کو ترقی کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ ورنہ اگر اصل واقعات کو دیکھا جائے تو لینن جس نظام کو لے کر چلا تھا اسے قائم کرتے ہوئے اسے متعدّد اصولوں کو بدلنا پڑا اور پھر اسٹالن نے اسے اور مسخ کر دیا۔ لینن نے کولکس کی بغاوت کا سامنا کرتے ہوئے ایک نئی زرعی پالیسی اختیار کی۔ پھر انٹرنیشلزم سے نیشلزم کی طرف ساری پالیسی کو پسپا ہونا پڑا۔ پھر مذہب دشمنی میں نرمی پیدا کرنی پڑی۔ پھر انفرادی املاک کے بارے میں ابتدائی اصولوں پر خاصی تحریف کی گئی پھر مغربی امپیریلزم کے جواب میں امپیریلزم کے کٹر دشمن بن کے اٹھنے والوں کو خود امپیریلزم کا علَم اٹھانا پڑا۔ یہ ساری بدعات واقع ہوئیں لیکن یہ ترقی کی شاہراہ کے لیے سنگِ میل قرار پائیں۔

بخلاف اس کے اسلام کے معیاری نظام میں اس طرح کی جو تبدیلیاں کی گئیں ان کے خلاف مسلمانوں میں نفرت نمودار ہوتی رہی، صلحاء ان کے خلاف ذہنوں کو تیار کرتے رہے، ان پر بندگانِ حق نے احتجاج کرنے کا حق ادا کیا اور جہاں کسی اصلاح پسند کو موقع ملا، اس نے اصل معیاری نظام کے اصولوں کو از سرِ نو برپا کرنے کی جدوجہد کی ایسی جدّ و جہد کی بہت سی مثالیں علم و فکر کی تاریخ میں موجود ہیں، اور سیاسی تاریخ میں بھی معیاری نظام کے احیا کی کامیاب ترین مثال

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں ملتی ہے۔ لیکن آپ کے علاوہ بہت سے ایسے اکابر کے کارنامے بھی ناقابل فراموش ہیں جو اگر کل کے کل نظام کا احیاء نہ کر سکے تو کم سے کم اس کے جن اجزاء کی تجدید کرنا ان کے بس میں تھا ان کو انھوں نے دوبارہ قائم کیا۔ تجدید و احیاء کی یہ اسپرٹ ملّتِ اسلامیہ میں بدستور کام کر رہی ہے اور اسی اسپرٹ کے زندہ ہونے کی وجہ سے ہم نظامِ اسلامی کی قدروں سے وابستہ ہیں اور ان کو زندگی میں عملاً کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں۔

تصریحِ ششم

ایک پاکباز سوسائٹی، ایک صالح نظامِ حکومت اور ایک بااخلاق تہذیب و معاشرت اگر چند روز کے لیے بھی صفحۂ ہستی پر جلوہ افروز ہو تو وہ اپنے مٹ جانے سے پہلے انسانی تاریخ پر گہرا اثر ڈال جاتی ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آج اگر مثلاً پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو اور بالفرض تیس ہی سال چل کر ختم ہو جائے تو بس وہ ایک حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی اور تاریخِ انسانی اور انسانیت کے نوعی ذہن و اخلاق پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ تمدّنِ انسانی کے نوامیس سے قطع نظر کر کے سوچتے ہیں دن چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو جائے اور چھوٹے چھوٹے دن میں آفتاب کے سامنے کتنے ہی لک لکہ ہائے ابر چھائے رہیں لیکن سورج کے طلوع کے چند فطری اثرات نباتات، جمادات اور حیوانات پر لازماً پڑتے ہیں یہاں تک کہ بعد میں لمبی رات کی تاریکی اور ٹھنڈک بھی اگر آ کر مسلّط ہوتی ہے تو بھی وہ دنیا سے سورج کے طبعی اثرات کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح نظامِ حق کا ظہور چاہے کتنے ہی قلیل وقت کے لیے ہو اور بعض وجوہ سے چاہے وہ ناقص ہی کیوں نہ رہ جائے پھر بھی اس کے اثرات انسانی زندگی پر پڑتے ہیں اور ان اثرات کو بعد میں تسلّطِ باطل بھی پوری طرح ملیامیٹ نہیں کر سکتا۔

آپ نیکی اور حق کے اجتماعی نظام کو الگ رکھ کر حق اور نیکی کے سپاہیوں کے انفرادی کارناموں پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ فرزندانِ انسانیت کے اچھے کارنامے ہی وہ نور ہیں جن سے ہمارا ایوانِ تاریخ روشن ہے، ان ہی کارناموں کے چراغ جلا کر ہم عظیم الشان مہموں کو سر کرنے کے لیے نکلتے ہیں، ان ہی کارناموں سے ہمارے ادبیات کی رگوں میں گرم گرم جذبات

کا خون رواں دواں ہے، ان ہی کارناموں سے ہمارے افکار غذا حاصل کرتے ہیں۔ ان ہی سے ہماری انقلابی تحریکیں سرگرمی اخذ کرتی ہیں اور ان ہی سے ہم آج بھی خیر کا سبق لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت امام حسینؓ کے زریں کارناموں کو سامنے رکھیے اور سوچیے کہ کیا ان بہی خواہانِ انسانیت کی خدمات حق نسیاً منسیّا ہوگئی ہیں اور تاریخ پر ان کا کوئی اثر باقی نہیں ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ حق اور نیکی کی راہ میں جینا تو جینا، اس راہ میں مرنا بھی عالمِ انسانی کے لیے ہزار در ہزار زندگیاں پیش کرتا ہے۔ جس پاکیزہ مقصد کے لیے ایک مرتبہ کوئی انسانی جان بھینٹ چڑھتی ہے اس کی قیمت پہلے سے بڑھ جاتی ہے اور اس کے فداکاری دکھانے والے عشّاق پہلے سے زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ میدان میں آنے لگتے ہیں۔ ایک وقت میں نیکی کے لیے جو بیج بویا جاتا ہے وہ پھر بار بار پھوٹتا رہتا ہے ہر انسانی ایثار جو حق کے لیے خاص ہوا ایک ایسا ققنس ہوتا ہے جو بار بار اپنی راکھ سے پیدا ہوتا رہتا ہے اور اپنے نغمۂ آتشیں سے فضا کو گرم کرتا رہتا ہے۔

جب انفرادی کارناموں کا اثر اتنا دوررس ہو تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نظامِ حق کے ظہور کا اثر کہاں تک پہنچتا ہوگا۔ چنانچہ عرب میں جو اسلامی نظامِ تہذیب و سیاست برپا ہوا تھا اس نے اپنے حلقۂ اثر میں آنے والوں پر بعض ایسے فکری و اخلاقی اثرات ڈالے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ آج تک کسی نہ کسی درجے میں برقرار ہیں۔ دوسری طرف اس نے اپنے مخالفین تک کے تہذیب و تمدّن کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ جن لوگوں کو علم و تحقیق سے کچھ بھی دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ مغرب میں نشأۃِ ثانیہ (Renaissance) کا ظہور جس نے فکری آزادی کے دور کا یورپ میں افتتاح کیا، براہِ راست اسلام کے اثرات کا ردِّ عمل تھا۔ اسی طرح مغربی اقوام کو فکری اور طبعی علوم کے خزانوں کی ساری کنجیاں بھی ان عربوں سے ہاتھ آئیں جو اسلام کے علمبردار تھے پھر مغرب کی سیاسی فکر کے ارتقا اور اس کے تاریخی پس منظر پر اگر آپ گہری نظر ڈالیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ جمہوری نظام سیاست بھی ملّتِ اسلامیہ کی مخصوص فکر کا ایک بالواسطہ نتیجہ ہے۔ افلاطون کی نظری جمہوریت درحقیقت مغربی جمہوریت کو ظہور میں لانے کی محرّک نہیں ہوئی بلکہ جمہوریت

کی عملی روح یورپ نے عربوں سے لی۔ اور اسے مادّہ پرستی کے قالب میں لاکر برسرِ عمل کیا۔ یہ اخوّت و مساوات اور عدل وغیرہ کے جو تصوّرات موجودہ دور میں ابھر رہے ہیں یہ دراصل اسلام ہی کے فکری عطیات کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ اسی طرح مغربی فلسفہ جو بدقسمتی سے خدا پرستی کے بجائے الحاد کی راہ پر چل نکلا۔ اس کے اندر اسلامی فلسفہ کے بے شمار اثرات گندھے ہوئے ہیں اور آج غلط افکار سے ترکیب پا کر وہ اتنے مسخ ہوگئے ہیں کہ ان کو پہچاننے میں دِقّت ہوتی ہے۔ علی ہذا القیاس قانون اور بین الاقوامی مسائل میں جدید دنیا نے اسلام سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ یہی حال ادبیات کا ہے۔

اگر اسلامی نظام تیس سال کے لیے برپا نہ ہوا ہوتا تو پھر اس کے یہ سارے نتائج کہاں سے آتے؟ پھر تو دنیا کا نقشہ دوسرا ہوتا۔ فلسفہ، سیاست، قانون، بین الاقوامیات اور مختلف علوم و ادبیات کا طرزِ نشوونما کوئی اور ہوتا۔

پس محض تیس سال، کہہ کر نظامِ حق کی قدر و قیمت گرا کر دکھانے کی جو کوشش کی جاتی ہے وہ نہایت درجہ لغو کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ حق اگر ایک دن کے لیے بھی بپا ہو سکے اور پورا نہیں آدھا پونا ہی بپا ہو سکے تو بھی آئندہ چند صدیوں کے لیے دنیا کے علم پر، دنیا کی سیاست پر، دنیا کے ادب پر، دنیا کے قانون پر ایسے مفید اثرات چھوڑ جائے گا کہ ان اثرات کے پیش نظر اسے ایک دن کے لیے بپا کرنے میں اگر ہزاروں جانیں صرف ہو جائیں تو بھی سودا مہنگا نہیں انسانیت کے لیے بجائے خود یہ چیز بہت بڑے درجے کا احسان ہے کہ اس کے سامنے زندگی کا ایک معیاری نقشہ عملاً پیش کر دیا جائے اور اگر یہ نقشہ زیادہ دیر تک قائم نہ رکھا جا سکے تو اس کی ایک جھلک دکھا دینا بھی انتہائی خیر کا وسیلہ ہوسکتا ہے، آج آپ دیکھتے ہیں کہ ادب میں خیالی نقشے (Utopia) پیش کر کے انسان کو فکری و اخلاقی ارتقاء کے لیے مصنوعی طور پر تحریک دلائی جاتی ہے۔ لیکن اگر خیالی نقشوں کو پیش کرنے کے بجائے ایسا ہو کہ ایک واقعی منظر ساری دنیا کو دکھایا جا سکے تو وہ ارتقاء کی تحریک دلانے میں کتنا مؤثر ہوسکتا ہے۔

وہ نظامِ حق جس کی تحقیر کرنے کے لیے بعض اصحاب کہتے ہیں کہ ''صرف تیس ۳۰ سال'' چلا تھا کبھی انہوں نے ٹھنڈے دل سے اس کی نوعیت اور اس کے معیار پر بھی غور کیا ہے؟

اس نظام نے ہر لحاظ سے جو حیرت انگیز معجزے دکھائے ہیں۔ کیا کبھی اس کا مذاق اڑانے والوں نے ان معجزوں کی لامثالیت کا بھی اندازہ کیا؟

یہ ایسا نظام تھا:

جو تقریباً ایک غیر خونی انقلاب کے ذریعہ بپا ہوا۔ پورے عرب میں اس کے قیام کے لیے چند ہزار سے زیادہ جانیں صرف نہیں ہوئیں۔

جو، سی آئی ڈی، قانونی تحکم، تشدّد اور سازش کاریوں کے بغیر چلا ہے، جس نے بے شمار انسانوں کی زندگیوں کا پورا نقشہ یکسر پلٹ کے دکھادیا۔ ان کو جاہل سے عالم، بلکہ معلم، ان کو بے اخلاق سے بااخلاق بلکہ نگرانِ اخلاق، ان کو فتنہ انگیزوں سے امن پسند بلکہ نگہبانِ امن اور ان کو بے نظم سے منظّم بلکہ ماہرینِ تنظیم بنادیا۔

جس کے تحت جرائم کا اوسط اتنا کم رہا ہے کہ آج کی مہذّب کہلانے والی اقوام میں سے کوئی اپنے جرائم کی تعداد اتنی گھٹا نہیں سکی۔

جس کی عدالتوں میں گنتی کے مقدمات پیش ہوئے۔

جس کے حکمرانوں کا معیارِ زندگی ہر لحاظ سے عوام کے برابر رہا۔

جس کے علمبرداروں نے قلّتِ تعداد اور بے سروسامانی میں بھی بڑی سے بڑی طاقتوں سے ٹکّر لے کر ان کا زور توڑ کر رکھ دیا۔

جس کی فوجوں نے میدانِ جنگ میں ٹھوس اخلاق کا مظاہرہ کیا اور اپنے دشمنوں پر بھی احسانات کیے۔

جس نے عوام کی فلاح و بہبود کا پورا پورا حق ادا کیا۔

جس نے اپنے اصولوں کے بارے میں کبھی سودا بازی (Compromise) کی روش اختیار نہیں کی۔

جس نے جماعت کی فکری وحدت کو ایسی مستحکم بنیادوں پر اٹھایا کہ نہ کوئی عصبیت اسے توڑ سکی، نہ سیاسی تفرقہ نمودار ہوا۔

اور جس کے خلاف بطور ردّ عمل نیچے سے کوئی ری ایکشنری تحریک نہیں بپا ہوئی۔ اور

جس میں روزمرّہ کی زندگی اعلیٰ انسانی اخلاق کے مظاہرے سے لبریز تھی اور گھٹیا اخلاق کے نمونے قریباً ناپید تھے۔

یہ معیاری نظام جس کی کوئی مثال کسی غیر اسلامی فکر کے علمبرداروں کی طرف سے آج تک سامنے نہ آسکی، اگر تیس سال تک چلا تو آخر اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ نوعِ انسانی کے سامنے زندگی کا ایک معیاری نمونہ اتنی دیر تک رکھا گیا کہ وہ اسے ہر پہلو سے خوب اچھی طرح دیکھ لے اور پھر اس کی نقل اتارنے کے لیے جدّ و جہد کرتی رہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی خیالی نقشہ (یوٹوپیا) ہمارے سامنے ہو، آج ماضی ایک ''امرِ واقعہ'' کو ہمارے سامنے لیے کھڑا ہے اور ہم ایک روشن مستقبل کی تعمیر اسے سامنے رکھ کر کر سکتے ہیں۔

بالفرض اگر دوبارہ یہی صورت پیش آئے کہ اس طرح کا صالح نظام صرف تین ۳ ہی سال کے لیے رونما ہو تو اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ انسانیت کی فلاح کی منزل آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں تازہ ہو جائے گی۔ ایک لمبی رات سے پہلے اگر چھوٹا دن بھی دنیا کو نصیب ہو جائے تو آفتابِ حق کے طلوع کی برکات دن گزر جانے کے بعد بھی برابر محسوس کی جاسکیں گی۔

اصول پسندی کا تقاضا

ان تصریحات کو ایک طرف رکھ کر خوب سوچیے کہ کسی اصول و نظام کے قبول یا رد کرنے کے بارے میں ایک سلیم الطّبع آدمی کا طرزِ فکر کیا ہونا چاہیے۔

آپ صفائی کے اصول کو ہر لحاظ سے پرکھ کر حق پاتے ہیں۔ لیکن فرض کیجیے کہ آپ ایک ایسے ماحول میں رہتے ہیں جو سخت گندہ ماحول ہے۔ آپ کی سوسائٹی کا ہر شخص گندگی پھیلانے میں سرگرم ہے اور سوسائٹی ایک نظامِ غلاظت چلا رہی ہے۔ فرض کیجیے آپ اپنے ماحول کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور اس سے آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول پر آج سے پچاس سال پہلے صرف ایک ہفتہ ایسا آیا تھا جب کہ یہاں ہر طرف صفائی ستھرائی تھی، ہوا میں تعفّن نہ تھا، کریہہ مناظر نہ تھے، بیماریاں نہ تھیں بلکہ پاکیزگی کا دور دورہ تھا لیکن یہ حالت تھوڑے دنوں رہ کر ختم ہوگئی اور پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی یا آپ کو تاریخ میں ایک دن بھی ایسا نہیں ملتا اب آپ کا رویّہ کیا ہوگا؟

کیا محض اس وجہ سے کہ سابق تاریخ میں صفائی کا دور بڑا مختصر سا گزرا تھا یا سرے سے

کوئی دور ایسا آیا ہی نہ تھا اور چونکہ آج تمام لوگ غلاظت پسند ہیں اور بظاہر پائداری نظامِ غلاظت ہی میں محسوس ہوتی ہے۔ آپ اپنے بارے میں یہ فیصلہ کریں گے کہ آپ کو بھی غلاظت پسند اور نظام غلاظت کا سچا خادم بن جانا چاہیے۔؟ نہیں اگر آپ کے اندر خودی زندہ ہوگی تو آپ یوں سوچیں گے کہ غلاظت بہر حال انسانیت کے لیے غلط اور مضر ہے اور صفائی کا اصول و نظام اس کے لیے برحق اور مفید ہے۔ اس لیے میرا فرض یہ ہے کہ نظامِ غلاظت کے خلاف لڑنے اور اصولِ صفائی کو عملاً قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادوں آپ اصول پسندوں کی طرح سوچیں گے کہ اصولِ صفائی کے تحت گزرنے والا ایک ہی دن اگر پوری زندگی کی جدو جہد کے معاوضے میں حاصل ہو تو بھی یہ غلاظت کے نظام کے تحت سو سال جینے سے زیادہ قیمتی ہوگا بلکہ آپ یہ عزم لے کر اٹھیں گے کہ صفائی کا نظام قائم کرنے کے لیے غلاظت سے لڑتے ہوئے اگر ساری زندگی ختم ہو جائے اور عملاً اس مہم میں ایک منٹ کے لیے بھی کامیابی حاصل نہ ہو تو بھی با اصول آدمی کا طرزِ عمل یہی ہو سکتا ہے اور جو لوگ اس ایمان اور اس طرزِ فکر کے ساتھ اٹھتے ہیں، بازی ان ہی کے ہاتھ رہتی ہے۔

بالکل اسی طرح اسلام کے اصول اور نظام کو معقول طریق سے جانچیے، اس کے برحق ہونے پر غور کیجیے، اس کے افادی نتائج کا اندازہ کیجیے۔ پھر اگر آپ کو یقین ہو جائے کہ یہی اصولِ نظام حق ہے، یہی مطابقِ فطرت ہے، یہی مفید انسانیت ہے تو اس کے بعد آپ کا طرزِ عمل اس کے سوا کچھ اور ہونا ہی نہ چاہیے کہ آپ اپنی ساری قوتیں اس اصول و نظام کو برپا کرنے کے لیے صرف کر دیں۔ اگر آپ کی کوششوں سے اسلام دوبارہ تیس ہی سال چلے گا تو بھی اس تیس سال کے عرصہ میں وہ خیر و برکت کے اتنے تحائف دنیا کو دے کر رخصت ہوگا کہ اس میں بگاڑ کے دوبارہ آنے میں ایک لمبی مدت صرف ہوگی۔

یہ جو ضرب المثل ہے کہ لومڑی کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی زیادہ اچھی ہوتی ہے، اس کو اگر آپ یوں بدل لیں تو اچھا ہو کہ نظامِ حق کے تحت ایک دن جینا نظامِ باطل کے تحت ہزار سال جینے سے زیادہ بہتر ہے بلکہ آپ اس سے بھی آگے بڑھیں اور یہ نظریہ سامنے رکھیں کہ غیر اسلامی نظام کے تحت امن چین سے پڑے رہنے سے وہ موت اچھی ہے جو اسلامی نظام کے قیام کی جدو جہد میں نصیب ہو۔!